© rasailojaraid.com

انتخاب حضرت حسنؓ

حضرت علیؓ کی وفات کے قریب آپ سے لوگوں نے کہا اِسْتَخْلِفْ (یعنی اپنا ولی عہد مقرر کر جائیے) آپ نے جواب میں فرمایا: "میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہؐ نے چھوڑا تھا" (البدایہ ج ۸ ص ۱۳-۱۴)

۲- ثم قال اِن مِتُّ فاقتلوه وان عشتُ فانا اعلم کیف اصنع به. فقال جندب بن عبد الله "یا امیر المومنین! ان متَّ نبایع الحسن؟" فقال "لا آمرکم ولا انهاکم، انتم ابصر" (البدایہ والنہایہ ص ۳۲۶ ج ۷)

پھر حضرت علیؓ نے فرمایا: اگر میں مر گیا تو اس (قاتل) کو قتل کر دینا اور اگر میں زندہ رہا تو میں جانوں میرا کام۔ حضرت جندب بن عبد اللہؓ نے کہا: "اے امیر المومنین! اگر آپ فوت ہو جائیں تو ہم حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟" فرمایا: "میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں۔ تم خود بہتر سمجھتے ہو۔"

۳- بُویِعَ للحسن بن علی علیه السلام بالخلافة وقیل ان اول من بایعه قیس بن سعد قال له ابسط یدک ابایعک علی کتاب الله عز وجل وسنة نبیه (طبری ج ۵ ص ۱۵۸)

حضرت حسنؓ بن علیؓ کی خلافت پر بیعت ہوئی اور کہتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے بیعت کی وہ قیس بن سعد تھا۔ اس نے کہا اپنا ہاتھ اٹھائیے۔ میں آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت پر بیعت کرتا ہوں۔"

ضمنی مباحث

ہم نے خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد سے متعلق حتی الامکان صحیح روایات اولین ماخذوں سے پیش کر دی ہیں۔ ان سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ آیا خلافت ایک انتخابی منصب ہے؟

۱۔ استخلاف یا نامزدگی | ۱۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اس یقین کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ "مسلمان کسی دوسرے کا خلیفہ بننا گوارا نہیں کر سکتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے"۔ تو پھر خلیفہ نامزد کر دینے سے نامزد نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ آپ کا ترک ارادہ جملہ مسلمانوں کی دلجوئی اور ان پر آپ کی شفقت کا مظہر تھا۔ یعنی اگر کچھ لوگ آس لگائے بیٹھے ہوں تو ان کی دل شکنی نہ ہو۔

ب۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ نامزدگی کے وقت ان کے سامنے مندرجہ ذیل باتیں تھیں۔

۱۔ ان کے نزدیک امت میں حضرت عمرؓ سے زیادہ خلافت کے لیے کوئی اہل تر نہ تھا۔

۲۔ انھوں نے اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو نامزد نہیں کیا۔

۳۔ نامزدگی کے سلسلہ میں خدا کے سامنے جوابدہی کا تصور غالب تھا۔

ج۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ کہا گیا کہ خلیفہ نامزد کر جائیے تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کہتے ہو۔ خلافت تو محض ایک انتخابی منصب ہے۔ بلکہ یوں فرمایا (اور اس وقت آپ کے ذہن میں مندرجہ ذیل باتیں تھیں)۔

۱۔ اگر میں خلیفہ نامزد کر جاؤں تو بھی ٹھیک ہے کہ یہ سنت اپنے سے بہتر آدمی (حضرت ابوبکرؓ) کی سنت ہے اور اگر نہ کروں تو بھی ٹھیک ہے کہ یہ مجھ سے بہتر آدمی (خود حضور اکرم) کی سنت ہے۔

۲۔ آپ نامزدگی کو اس صورت میں ترجیح دے سکتے تھے جب کہ کوئی اہل تر آدمی ان کے پاس موجود ہوتا۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عبیدہ بن الجراحؓ اور سالمؓ کے نام بھی لیے۔ کہ اگر ان میں سے کوئی بھی زندہ ہوتا تو اسے ہی نامزد کرنے کو ترجیح دیتے۔

۳۔ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو آپ نے اس لیے نامزد نہیں کیا تھا کہ وہ خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ایک کٹھن کام سمجھتے تھے اور خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور سے ڈر کر خلافت کو اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔

۴۔ اب ثانوی شکل یہ رہ گئی تھی کہ انھوں نے خلافت کے لیے ۶ آدمیوں کو نامزد کر دیا۔ کسی ایک کے نامزد نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی نظر میں ان چھ آدمیوں میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خامی تھی[1]۔ لہٰذا انتخاب کی ذمہ داری انہی پر ڈال دی۔ اگر

---

[1] الفاروق۔ شبلی نعمانی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھیں کسی ایک شخص پر بھی اطمینان ہو جاتا تو وہ یقیناً نامزدگی کو انتخاب پر ترجیح دیتے

د۔ حضرت عثمانؓ سے بھی ایک مرتبہ لوگوں نے خلیفہ نامزد کرنے کو کہا تھا۔ یہ سوال جواب بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

اخبرنی مروان بن الحکم قال: اصاب عثمان ابن عفان رُعافٌ شدید سنة الرُّعاف حتّٰی حبسه عن الحج واوصٰی فدخل علیه رجل من قریشٍ قال: استخلف قال "وقالوه"؟ قال نعم قال "ومن"؟ فسکت فدخل علیه رجلًا اخرُ احسبه الحرث فقال استخلف فقال عثمان "وقالوا"؟ قال نعم، قال ومن هو؟ فسکت. قال: فلعلهم قالوا الزبیر؟ "قال نعم"، قال "اما والذی نفسی بیده انه لخیرهم ما علمت وان کان لَاَحَبَّهُمْ الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب زبیر بن العوام)

مروان بن حکم نے مجھے خبر دی کہ حضرت عثمانؓ کو ایک سال نکسیر پھوٹنے کی ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ وہ حج کو بھی نہ جا سکے اور وصیت کرنے لگے۔ قریش کے کسی آدمی نے انھیں کہا "کوئی خلیفہ بنا جائیے"۔ کہنے لگے "کیا لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں"؟ وہ کہنے لگا۔ ہاں۔ آپ نے پوچھا "کس کے متعلق کہتے ہیں؟" تو وہ چپ ہو رہا۔ پھر ایک اور آدمی آیا۔ میرا خیال ہے وہ حارث تھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ کسی کو خلیفہ بنا دیجیے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا۔ کیا لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں؟ کہنے لگا "ہاں" آپ نے پوچھا "کس کے متعلق؟" تو وہ بھی چپ رہا۔ پھر آپ نے فرمایا "شاید وہ حضرت زبیرؓ بن عوام کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا۔ ہاں"۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جتنے لوگوں کو میں جانتا ہوں زبیرؓ بن عوام ان سب سے بہتر ہیں اور سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی اگلی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے تین بار یہ بات دہرائی کہ "تم خود جانتے ہو کہ زبیر بن عوام تم سب میں سے بہتر ہیں"۔

بخاری شریف کے مترجم علامہ وحید الزمان نے اس حدیث پر یہ نوٹ بھی دیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ نے اپنے بعد خلافت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کے لیے لکھ کر اپنے منشی کے پاس وہ کاغذ رکھوا دیا تھا۔ مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ ان کی زندگی میں ہی ۳۲ھ میں انتقال کر گئے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہل تر آدمی موجود ہو تو نامزدگی کو نہ تو خلفائے راشدین ہی ناجائز سمجھتے تھے اور نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

۵۔ حضرت علی رضؓ کو آخری وقت میں حضرت حسن رضؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے نہ تو یہ فرمایا کہ استخلاف ناپسندیدہ یا ناجائز کام ہے اور نہ ہی یہ فرمایا کہ باپ کے بعد بیٹا کیونکر نامزد کیا جا سکتا ہے۔ جب حضرت جندب بن عبداللہ رضؓ صحابی رسول نے آپ سے فرمایا کہ ہم حضرت حسن کے ہاتھ بیعت کر لیں۔ تو آپ نے فقط یہ فرمایا:۔

"نہ میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ تم لوگ اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔"

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ خلافت محض انتخابی منصب نہیں بلکہ خلیفہ وقت خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور کو سامنے رکھ کر اگر خلیفہ نامزد کر جائے تو یہ صورت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضؓ کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے اور دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بھی خلیفہ بن سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت حسن رضؓ کی خلافت کو متفقہ طور پر خلافت راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے اور تیسرا یہ کہ باپ اگر خود بیٹے کو نامزد کر دے بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو تو یہ بھی کوئی گناہ کی بات نہیں۔ بلکہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضؓ کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔

خلافت و ملوکیت

یہاں آکر خلافت اور ملوکیت کی ایک سرحد آپس میں مل جاتی ہے۔ ہم یہ پہلے بتلا چکے ہیں کہ خلافت، ملوکیت اور موجودہ جمہوریت کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔ اسے نہ ملوکیت سے بیر ہے نہ موجودہ جمہوریت سے کوئی کد۔ حضرت داؤد علیہ السلام بیک وقت خلیفہ بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ داؤد علیہ السلام کے متعلق درج ذیل آیت میں بعض علماء نے خلیفہ کا ترجمہ "بادشاہ" سے بھی کیا ہے۔ مثلاً۔

یَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (۳۸/۲۶)

"اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔" (احمد علی رح)

" " " " " " " " (فتح محمد جالندھری)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ نے خود بھی داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بھی کہا ہے اور بادشاہ بھی۔ بادشاہ کے لیے مَلِک اور بادشاہت کے لیے مُلک کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۲۵۱)

اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے سلطنت اور حکمت داؤد کو دی (احمد علی)

اور داؤد نے جالوت کو قتل کر ڈالا اور خدا نے ان کو بادشاہی اور دانائی بخشی (فتح محمد)

گویا داؤد علیہ السلام خلیفہ بھی اور بادشاہ بھی تھے۔ جب نظامِ حکمرانی کا پہلو اجاگر کرنا مقصود تھا کہ وہ حق کے ساتھ فیصلے کریں اور خواہشات کی پیروی نہ کریں تو ان کے لیے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا گیا اور جب ان کے اقتدار، سلطنت، بادشاہی یا حکومت کی طرف اشارہ مقصود تھا تو مُلک یا مَلِک کا لفظ استعمال کیا گیا جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰)

اور ہم نے داؤد کی سلطنت کو مستحکم بنایا اور اسے حکمت اور قوتِ فیصلہ بھی بخشی۔

معلوم ہوا کہ ملوکیت فی نفسہٖ مذموم نہیں جیسا کہ آج کل مغربی جمہوریت سے متاثر لوگ محسوس کرتے ہیں۔ داؤد علیہ السلام کے بیٹے سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خود بادشاہی کے لیے یوں دعا مانگی۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (۳۸/۳۵)

اے پروردگار مجھے مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا کر جو میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو (فتح محمد جالندھری)

اور سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمائی۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کو خدا نے بادشاہت عنایت فرمائی۔ (۱۲/۱۰۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے عرض کی کہ کوئی بادشاہ مقرر کر دیجیے تو نبی نے فرمایا:۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (۲/۲۴۷)

اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔

اس نبی نے بنو اسرائیل سے یا خدا نے نبی سے یہ نہیں فرمایا کہ ملوکیت تو بُری شے ہے اس کا سوال کیوں کرتے ہو؟ اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنی قدرت اور حاکمیت ان الفاظ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیان فرمائی کہ جسے چاہے بادشاہی عطا کرے اور جس سے چاہے چھین لے۔

قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء (۳/۲۶)

کہو! اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔

پھر اللہ تعالیٰ جس طرح اپنے فرمانبردار بندوں پر خلافت کی نعمت کا ذکر کرتے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے گزر چکا) اسی طرح بادشاہ بنانے کی نعمت کا بھی ذکر فرماتے ہیں۔

فقد اتینا ال ابراھیم الکتب والحکمۃ واتینھم ملکا عظیما (۴/۵۴)

سو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور دانائی عنایت فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

واذ قال موسیٰ لقومہ یقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا۔ (۵/۲۰)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم پر خدا نے جو احسان کیے ہیں ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں سے پیغمبر پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔

ہاں اگر بادشاہ اللہ کی فرمانبرداری کے بجائے سرکشی کی راہ اختیار کرے تو ملوکیت ایک مذموم چیز بن جاتی ہے۔ فرعون، نمرود، شداد، ہامان اسی قسم کے بادشاہ تھے۔ ایسی ہی مطلق العنان اور استبدادی حکومت کو قرآن کریم نے مذموم قرار دیا ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملک عضوض" کے نام سے پکارا ہے۔ خلافت و ملوکیت کے فرق کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر ہے۔

حضرت عمرؓ نامزد ہوئے یا منتخب؟

خلافت راشدہ میں استخلاف کی واضح مثال حضرت عمرؓ کی نامزدگی ہے جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے قبل نامزد کیا تھا۔ لیکن بعض دوستوں نے اسے بھی انتخابی خلافت ہی میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ استخلاف کا یہ تصور موجودہ جمہوریت کے تصور انتخاب سے متصادم ہے۔ یہ حضرات اسے انتخاب ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے نامزدگی کا اعلان کرنے سے پیشتر اکابر صحابہؓ سے مشورہ کر لیا تھا۔ لہٰذا یہ نامزدگی بھی فی الحقیقت عوام کا انتخاب ہی تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس معاملہ میں بھی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اصل واقعہ بروایت صحیح ہم پیش کر چکے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کے استخلاف یا نامزدگی کا پختہ عزم رکھتے تھے جیسا کہ پہلی روایت کے ابتدا ہی میں لفظ عقد سے واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بلا کر ان سے تذکرہ کیا۔ تو انھوں نے ان کی سختی کا شکوہ کیا۔ تو آپ نے حضرت عبدالرحمٰن کی رائے قبول نہیں کی بلکہ ان کی رائے کو ہموار کیا۔ حضرت عثمانؓ سے بلا کر تذکرہ کیا تو انھوں نے اس نامزدگی کی داد دی۔

بعد ازاں جب اس بات کا تذکرہ عام ہونے لگا تو حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی تیزیٔ طبیعت کا شکوہ کیا تو آپ نے یہ کہہ کر ان کی رائے کو بھی ہموار کر لیا کہ اس نامزدگی کے لیے خدا کے حضور میں جواب دہ میں ہوں۔ میں کہہ دوں گا کہ مجھے تیری امت میں عمرؓ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔

مشورہ وہ ہوتا ہے جس میں دوسروں سے رائے لے کر اس پر غور کیا جائے۔ لیکن یہاں دوسروں کی رائے کو ہموار کر کے مطمئن کیا جا رہا ہے۔ ان حقائق کے باوجود بھی اگر ہمارے یہ دوست اس واقعہ کو انتخابی خلافت کے زمرہ میں شمار کریں تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا (۳/۸)

اے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھ نہ پیدا کرنا۔

انتخابی خلافت کا تصور؟

نظام خلافت میں انتخاب کا وہ تصور سرے سے ناپید ہے جو مغربی طرز انتخاب کا طرۂ امتیاز ہے جس میں فیصلہ کثرت رائے کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ حضرت ابوبکرؓ کو بقول حضرت عمرؓ صرف ایک شخص (حضرت عمرؓ) نے انتخاب کیا۔ حضرت حسنؓ کو صرف ایک شخص قیس بن سعد نے انتخاب کیا۔ حضرت علیؓ کو اہل بدر اور شوریٰ میں سے (جو کہ بقول حضرت علیؓ انتخاب کے جائز حق دار تھے) ایک قلیل تعداد نے انتخاب کیا تھا۔

البتہ حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا استصواب عام انتخابی خلافت کے لیے ایک واضح ثبوت ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ یہ ثبوت بھی اس معیار پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورا نہیں اترتا۔ جس معیار پر ہمارے یہ دوست اتارنا چاہتے ہیں۔ پوری مملکت اسلامیہ ایک وقت ایک لاکھ ۲۰ ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی تھی جب کہ یہ انتخاب صرف مدینہ میں ہوا اور وہ بھی چیدہ چیدہ لوگوں سے۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب سے دو باتیں سامنے آتی ہیں :۔

۱۔ انتخاب کا فیصلہ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے کیا اور اس اختیار کی بنا پر کیا جو انھیں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے دیا تھا۔ کثرتِ رائے اس کی حقیقی بنیاد نہ تھی۔

۲۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جیسا کہ حدیث مندرجہ سے واضح ہے۔ اس اصول کی بنا پر حضرت عثمان کو منتخب کیا تھا کہ وہ کتاب و سنت کے علاوہ پہلے دونوں خلفاء کے نظائر کا اتباع کریں گے۔ یہ بات حضرت علیؓ نے تسلیم نہ کی تھی۔ لہذا ان کو منتخب نہ کیا گیا گویا فیصلہ بہرحال اصول کے تحت تھا، محض کثرتِ رائے کے تحت نہ تھا۔ البتہ کثرتِ رائے بھی اس دلیل کے ساتھ مل گئی تو فیصلہ کرنا مزید آسان ہو گیا۔

۳۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے صرف ان لوگوں سے ہی مشورہ کیا تھا جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ روایات کے الفاظ سے صاف واضح ہے۔ خواہ وہ چرواہے تھے یا مدرسہ کے طالب علم، پردہ نشین عورتیں تھیں یا راہ چلتے مسافر۔ مشورے کا یہ تصور بھی موجودہ طرزِ انتخاب (حق بالغ رائے دہی) کو باطل قرار دیتا ہے۔

انتخاب عام

اگر حضرت ابوبکرؓ چاہتے تو پوری مملکت میں استصواب کروا سکتے تھے ان کے پاس وقت تھا۔ اور اگر حضرت عمر چاہتے تو وہ بھی کروا سکتے تھے کیونکہ وسائل رسل و رسائل اتنی ترقی کر چکے تھے کہ مسلمانوں کی مردم شماری کی لسٹ تیار کرنے کا کام عہد نبوی میں ہی شروع ہو چکا تھا (بخاری۔ کتاب العباد والسیر باب کتابۃ الامام الناس) اور حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ کام ایک علیحدہ شعبہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن ان بزرگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا وہ تصور ہی سرے سے مفقود ہے جو مغربی طرزِ انتخاب میں پایا جاتا ہے۔

ماحصل

۱۔ خلیفہ کو اگر شوریٰ منتخب کرے تو یہ سب سے بہتر صورت ہے۔ کیونکہ حضور اکرمؐ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسوہ یہی ہے اور حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:۔

لا خلافة الا عن مشورة (مصنف ابن ابی شیبة ج ۳ ص ۱۲۹)

مشورہ کے بغیر خلافت نہیں [1]

حضرت ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے تھے:۔

الامرة ما اؤتمر فیها وان الملك ما غلب علیه بالسیف (طبقات ج ۴ ص ۱۱۳)

امارت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے قبضہ حاصل کیا گیا ہو۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے عمل سے اس منصب کو شوریٰ کے سپرد کیا۔ اگرچہ اول الذکر دونوں ہستیاں استخلاف کی طرف مائل نہیں۔

۱۔ شوریٰ (یا) انتخاب کے بعد نامزدگی یا استخلاف کا نمبر ہے جسے حضرت ابوبکرؓ نے عملاً اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اسے درست سمجھا۔

۲۔ ہنگامی صورت حال میں شوریٰ کے ایک ممبر کی بیعت سے خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت منعقد ہوئی۔ اسی طرح ہنگامی صورت میں عوام الناس (شوریٰ کے بغیر) کی بیعت سے بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کی خلافت منعقد ہوئی۔

۳۔ باپ کے بعد بیٹے کی خلافت بھی جائز ہے بشرطیکہ وہ اہل ہو جیسے حضرت حسنؓ کی خلافت یا حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ کی خلافت ہے۔

مندرجہ بالا مختلف صورتوں سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خلافت ان معنوں میں انتخابی منصب ہرگز نہیں ہے جو معنی جمہوریت نواز پہنانا چاہتے ہیں۔ یہاں عوامی رائے دہندگی یا موجودہ قسم کی نمائندگی کا کوئی چکر نہیں۔

---

[1] بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے ان کی مراد خلافت کے کاروبار یا نظم سلطنت میں مشورہ کرنا ہے۔ یعنی اصول حکومت مشورہ ہے۔ خلیفہ کے تقرر پر مشورہ ضروری نہیں۔ اور یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جیسا کہ عثمانؓ کے انتخاب کے عنوان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعلقہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ان کا کسی ایک شخص پر اطمینان ہو جاتا تو وہ یقیناً استخلاف کو انتخاب پر ترجیح دینے کو تیار تھے۔ تاہم ہمارا خیال یہی ہے کہ امر خلافت بھی اس سے خارج نہ کرنا چاہئے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے طویل خطبہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے قول سے بھی ثابت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ طریقِ انتخاب

ہمارے جمہوریت نواز دوست عموماً یہ تاثر دیتے ہیں کہ:

۱۔ سقیفہ بنی ساعدہ اس دور کا پارلیمان تھا۔

۲۔ جہاں انصار و مہاجرین نے سرکردہ حضرات نے جو اس دور کے قبائلی نظام کے مطابق اپنے اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں حصہ لیا اور

۳۔ نتیجۃً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کثرت رائے سے منتخب ہو گئے تھے۔

۴۔ انصار و مہاجرین کی حیثیت بھی آج کل کی سیاسی پارٹیوں سے ملتی جلتی تھی۔

لہٰذا اندریں صورت موجودہ دور کے طرزِ انتخاب میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو اسلامی طرزِ انتخاب سے متصادم ہو۔

اب ہم ان چاروں اجزا کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

۱۔ سقیفہ بنی ساعدہ سقف عربی زبان میں چھت کو کہتے ہیں۔ دو مکانوں کے درمیان اگر کوئی گلی ہو اور اس پر چھت ڈال کر — خواہ وہ محض سائبان ہو یا لکڑی وغیرہ کی چھت — گلی کو سایہ دار بنا لیا جائے تو اسے سقیفہ کہا جاتا تھا۔ سقیفہ کا ترجمہ مولانا وحید الزمان نے "منڈوا" کیا ہے۔ بعض دوسرے علماء اسے سائبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ڈیرا (پنجابی دارا) کہتے ہیں۔

یہ ڈیرہ محض قبیلہ خزرج کی ایک شاخ "بنو ساعدہ" کا تھا۔ جس سے حضرت سعد بن عبادہ تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ ڈیرہ یا سائبان ان ہی کے مکان سے ملحق تھا۔ فراغت کے اوقات روزمرہ کی عام گفتگو کے لیے یہاں چند لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ یہ نہ تو کوئی ایسا مقام[۱] تھا جو مدینہ بھر کے معززین کے لیے مخصوص ہو۔ یا اس جگہ اتنے آدمیوں کی گنجائش ہو۔ پھر

---

[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حال سن کر ایک طرف مسجد نبوی میں لوگ جمع (باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کوئی پولنگ سنٹر بھی نہ تھا کہ کسی کے دل میں یہ خیال تک آسکتا کہ انتخاب کے وقت یہ جگہ ہی موزوں رہے گی۔ لہٰذا اسے، اس سقیفہ کو پوری امت کا پارلیمان قرار دینا ہر لحاظ سے حقائق کے خلاف ہے۔

۲۔ نمائندگان کی موجودگی جب عام لوگ اور خصوصاً مہاجرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے تو رئیس انصار حضرت سعد بن عبادہؓ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے چند ہمراہیوں کو اکٹھا کیا۔ ان کا یہی خیال تھا کہ مہاجرین کو اطلاع دیے بغیر ان کی بے خبری میں خلیفہ کا انتخاب ہو جائے تو پھر کسی کو بھی اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا وہ اس مسئلہ کو جلد از جلد طے کر لینا چاہتے تھے۔

اتفاقاً کسی صحابی نے حضرت عمرؓ کو اس صورت حال سے مطلع کیا اور کہا کہ آپ کو جلد وہاں پہنچ کر خبر لینی چاہیے۔ تو ایک روایت کے مطابق وہ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوعبیدہؓ بھی دو اور ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ سقیفہ بنی ساعدہ میں کل چار یا پانچ مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

اب تاریخی حقائق یہ ہیں کہ فہر بن مالک (ملقب قریش۔ قبیلہ قریش کے جد امجد) تک تیرہ پشتوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب جا کر مل جاتا ہے۔ عہد نبوی میں قبیلہ قریش کی بے شمار ذیلی شاخیں موجود تھیں تاہم یہ دس قبیلے زیادہ مشہور تھے۔ جو سب مسلمان ہو چکے تھے۔ ہاشم، اُمیہ، نوفل، عبدالدار، اسد، تیم، مخزوم، عدی، جمح، سہم۔

زمانہ جاہلیت میں قریش کی شرافت و حکومت زیادہ تر ان دس خاندانوں میں منحصر و منقسم تھی۔ ان معزز سردار خاندانوں کی ذمہ داریاں یہ تھیں:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہو گئے تھے ان میں تقریباً سب مہاجرین تھے۔ کیونکہ مہاجرین کے مکانات اسی علاقہ میں زیادہ تھے۔ یہاں انصار بہت کم تھے۔ دوسری طرف بازار کے متصل سقیفہ بنی ساعدہ میں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ اس مجمع میں تقریباً سب انصار ہی تھے۔ کوئی دو مہاجر بھی اتفاقاً وہاں موجود تھے۔

(تاریخ اسلام۔ اکبر خان نجیب آبادی ج ۱ ص ۲۷۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنو ھاشم کے ذمہ سقایت یعنی حاجیوں کو پانی پلانے کا کام تھا۔

بنو نوفل بے زاد حاجیوں کو توشہ اور زادِ سفر مہیا کرتے تھے۔

بنو عبدالدار کے پاس خانہ کعبہ کی چابی اور دربانی تھی۔

بنو اسد سے متعلق مشورہ اور دارالندوہ کا کام تھا۔

بنو تمیم کے متعلق خوں بہا اور تاوان کا فیصلہ تھا۔

بنو عدی سے متعلق سفارت اور قومی مفاخر سے کام تھا۔

بنو جمح کے پاس شگون کے تیر تھے۔

بنو سہم کے متعلق بتوں کا چڑھاوا وغیرہ تھا۔

بنو امیہ۔ سپہ سالاری ان سے متعلق تھی۔

بنو مخزوم۔ سپہ سالاری (خالد بن ولید اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے)

حضرت ابوبکرؓ اپنے قبیلہ تمیم کے سردار جو خوں بہا اور تاوان کا فیصلہ کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ بنو عدی سے تھے اور سفارت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ جنگ میں سفیر بن کر جاتے اور مقابلہ میں قومی تفاخر بیان کرتے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح فہر کے پوتے الحلج کی اولاد سے تھے گویا یہ مندرجہ بالا دس مشہور قبیلوں کے علاوہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن وقاص بنو تیم (ابن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر) کی اولاد سے تھے۔ یہ خاندان بھی مندرجہ دس خاندانوں کے علاوہ ہے۔

سقیفہ مذکورہ میں بیعت کرنے والے مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ پانچ تک ثابت ہے ضروری نہیں کہ یہ سب قریش سے ہی تعلق رکھتے ہوں۔ اگر ان سب کو قریشی ہی فرض کر لیا جائے تو بھی یہ مندرجہ تین یا زیادہ سے زیادہ چار قبیلوں کے نمائندہ تھے تو کیا اس طرح مغربی طرزِ انتخاب کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں جب کہ قریش کے اکثر قبیلوں کا ووٹ کاسٹ ہی نہیں ہوئے بد پھر انصار کا معاملہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ انصار میں دو بڑے قبائل اوس اور خزرج شامل تھے۔ جن کی ذیلی شاخوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تو کیا وہاں سینکڑوں قبائل کے نمائندوں کی گنجائش تھی۔

پھر انصار نے جس عجلت میں یہ مہم سرانجام دینے کی ٹھان رکھی تھی۔ یہ بات قطعاً بعید از

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیاس معلوم ہوتی ہے کہ تمام قبائلی نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی جاسکتی ہو۔ یا اس قلیل وقت میں یا غیر متوقع موقع پر سب سرداروں کا جمع ہونا از خود ناممکنات سے ہے۔

پھر یہ قبائلی سردار اس طرح منتخب نہیں ہوتے تھے جس طرح آج کل کسی وارڈ کے ممبر کا انتخاب کثرت رائے سے ہوتا ہے۔ ان قبائل کا معیار انتخاب بالکل سادہ اور فطری ہوتا تھا۔ عام طور پر تین باتیں ملحوظ رکھی جاتی تھیں۔

(۱) عمر میں بڑا ہونا (۲) سمجھ دار اور تجربہ کار ہونا (۳) اپنی عادات و خصائل کی بنا پر محترم ہونا۔

گویا ان سرداروں کا انتخاب کسی مخصوص مجلس یا مخصوص وقت میں نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ فیصلہ کے لیے چند معززین لوگ اپنی نجی گفتگو اور مجلس میں یہ رائے قائم کر لیتے تھے کہ آجکل فلاں شخص ہی اس رتبہ کا اہل ہے۔ ایسی ہی چند متفرق اور نجی مجلسوں میں رائے زنی کے بعد اسے سردار منتخب کر لیا جاتا تھا۔ اس سردار کے اس منصب کی توثیق کے لیے قبیلہ کے ہر کہ و مہ سے رائے لینا چنداں ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسلام نے آکر ان اہلیتوں میں صرف علم اور تقویٰ کا اضافہ کیا اور پہلی اہلیتوں کو برقرار رہنے دیا۔

اب ایک دوسرے پہلو سے بھی غور فرمائیے۔ اس وقت مسلمان صرف مہاجرین و انصار ہی کا نام نہ تھا۔ بلکہ وفات النبیؐ کے وقت جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ تو کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان بیس لاکھ افراد کے نمائندوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں شرکت کی ہوگی اور انصار و مہاجرین کے قبائل کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے نمائندے بھی شامل ہوئے ہوں گے۔ ان حالات میں تو یہ انتخاب بالواسطہ انتخاب کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتا۔ براہِ راست انتخاب تو دور کی بات ہے۔

نمائندگی کی ضرورت:

عوام کے نمائندوں کی ضرورت اس مشہور واقعہ سے جائز ثابت کی جاتی ہے جو بخاری میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ جب قبیلہ ہوازن کے قیدی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیے تو اسی قبیلہ کے سرکردہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور التجا کی کہ ان کے قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب فرمایا اور کہا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"........ اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو پھیر دوں۔ جو کوئی خوشی سے چاہے ایسا کرے اور جو اپنا حصہ واپس نہ کرنا چاہے تو وہ ٹھہرا رہے۔ آئندہ جب غنیمت کا مال آئے تو ہم اسے معاوضہ ادا کر دیں گے۔"

لوگوں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ ہم بخوشی یہ قیدی واپس کر دیتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا: "مجھے یہ کیسے معلوم ہو کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں (کیونکہ مسلمان بہت تھے) تم ایسا کرو۔ کہ تم اپنے اپنے نقیبوں (حدیث میں عوفاءکم کا لفظ ہے۔ عوفاء، عریف بمعنی چودھری کی جمع ہے) سے اپنی اپنی مرضی کہلا بھیجو۔"

یہ سن کر لوگ چلے گئے اور عریف لوگ اپنے اپنے لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کے پاس آئے اور کہا۔ "لوگ برضا و رغبت قیدی واپس کرنے کو تیار ہیں۔" (بخاری کتاب الجہاد والسیر)

اس واقعہ سے موجودہ طرزِ انتخاب میں نمائندوں کی ضرورت اور جواز ثابت کیا جاتا ہے جب کہ اس واقعہ اور موجودہ انتخابات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اس واقعہ میں لوگوں کو فرداً فرداً اپنے حقِ ملکیت سے دست بردار ہونے کی اپیل کی گئی تھی اور اگر کسی ایک آدمی کی بھی مرضی نہ ہوتی اور وہ مجمع عام میں خاموش رہتا تو یہ ایک قسم کا ظلم تھا۔ لہٰذا ہر ایک ہی فرداً فرداً مرضی معلوم کرنے کی ضرورت تھی جو اہل محلہ یا محلہ کے چودھری ہی بذریعہ بات چیت معلوم کر سکتے تھے۔ مگر شوریٰ یا امیر کا انتخاب اسلامی نقطۂ نظر سے عوام کا حق ہے ہی نہیں۔ وہ تو ایک ذمہ داری ہے۔ انتخاب کرنے والے اور منتخب ہونے والے سب کے متعدد اوصاف ہیں۔ اور انتخاب کنندگان (یا اہل الرائے) پر ایک ذمہ داری اور بوجھ ہے کہ وہ یہ امانت اسی شخص کے حوالے کریں جو اس کا اہل تر ہو ورنہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

۳۔ کثرتِ رائے اور انتخاب حضرت ابوبکرؓ

ہم بخاری کی حدیث سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اپنے بیان کے مطابق صرف انہوں نے اکیلے بیعت کی جسے اللہ تعالیٰ نے کامیاب بنا دیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے پھر دو تین مزید موجود قریشیوں نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار کے موجود لوگوں میں سے اکثر نے بیعت کر لی اب حضرت عمرؓ کا بیان یہ ہے کہ میں نے اکیلے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور خدا نے اسے کامیاب بنا دیا۔ جس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ بیعت کرنے والوں کی گنتی مقصود نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ خلافت کے انتخاب کے متعلق مشورہ دینے والوں کی گنتی مقصود ہے۔ اور وہ صرف حضرت عمر کی ذات تھی۔

اسی طرح حضرت حسنؓ کی بیعت بھی صرف ایک شخص قیس بن سعد بن عبادہ نے کی۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بیعت کی اور یہ خلافت بھی منعقد ہو گئی جس کی صحت میں انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک فردِ واحد کی رائے پر بھی خلافت کا منعقد ہو جانا ثابت ہے اگرچہ یہ ہنگامی حالات کے تقاضے تھے — تو پھر کثرتِ رائے کا سوال ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ جب کثرتِ رائے حق کا معیار رہی نہیں (جیسا کہ مشورہ کے عنوان کے تحت تفصیلاً مذکور ہے) تو پھر کثرتِ رائے کو ثابت کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ کیا جمہوری طرزِ انتخاب میں ایسی گنجائش موجود ہے کہ ہنگامی صورت میں کوئی شخص برسرِ اقتدار آ جائے یا اسے چند اشخاص لے آئیں تو اسے آئینی سربراہ سمجھ لیا جائے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

٣- سیاسی جماعتوں کا وجود

کیا انصار و مہاجرین سیاسی جماعتیں تھیں؟

مہاجرین و انصار میں خلافت کے معاملہ پر سقیفہ بنی ساعدہ میں چند لمحات کے لیے نزاع پیدا ہوئی جو اسی مقام پر ختم ہو گئی۔ تو اس واقعہ کی بنا پر مہاجرین و انصار کو آج کل کی سیاسی پارٹیوں کے مماثل قرار دینا، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جمہوریت نواز دوستوں کی بہت بڑی جسارت ہے۔ جب یہ مہاجرین اولین مکہ کی گلیوں میں پٹ رہے تھے اور کفار کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے تھے تو کیا یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا کہ ہم کبھی نہ کبھی وقت کار دبارِ حکومت پر قابض ہوں جیسا کہ موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں کا بنیادی مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔

مہاجر اور انصار تو صفاتی نام ہیں جو ان کو خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے۔ کیا یہ گروہ مہاجرین و انصار ایسے ہی اغراض و مقاصد کے تحت وجود میں آئے تھے۔ جیسے موجودہ دور میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے؟ کتنا گھناؤنا الزام ہے یہ صحابہ کبارؓ پر۔

اب ذرا جمہوریت کے علمبرداروں کی زبانی سیاسی جماعت کی تعریف سنیئے۔ بعد میں فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

١- میک آئیور :- "ایسی جماعت جو کسی اصول یا پالیسی کی بنیاد پر منظم ہو اور جو آئینی ذرائع سے حکومت سنبھالنے کی کوشش کرے۔"

٢- گلکرائسٹ :- "شہریوں کا ایک منظم گروہ جو ایک ہی سیاسی عقیدہ رکھتے ہیں اور جو سیاسی اتحاد کے ذریعہ اقتدار حکومت کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔"

٣- لارڈ برائس :- "منظم جماعتیں جن کی رکنیت رضا کارانہ ہوتی ہے اور جن کا پورا زور سیاسی طاقت کے حصول پر صرف ہوتا ہے۔" (اصول سیاسیات مصنفہ صفدر رضا صدر شعبہ سیاسیات بعنوان سیاسی جماعتیں ص ٣٠٩۔ پانچواں ایڈیشن)

گویا موجودہ جمہوری دور میں ایک سیاسی جماعت میں تین عناصر کا وجود ضروری ہے (١) کسی مخصوص سیاسی عقیدہ کی بنا پر اس کی تشکیل (٢) رضا کارانہ تنظیم اور (٣) تشکیل کا مقصد اقتدار کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصول ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں جو سیاسی جماعتیں الیکشن ہار جاتی ہیں۔ وہ حزبِ اختلاف کی شکل میں اپنا مستقل وجود برقرار رکھتی ہیں۔ یہ جمہوری طرزِ انتخاب میں لازمی عنصر ہے جس کے بغیر اسمبلیاں تشکیل پا ہی نہیں سکتیں۔ اب بتلائیے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے انعقاد کے بعد کونسا حزبِ اختلاف باقی رہ گیا تھا؟

پھر اس حزبِ اختلاف کا کام حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ اور چونکہ ہر سیاسی جماعت — خواہ وہ حزبِ اقتدار ہو یا حزبِ اختلاف میں ہو — اپنا مستقل سیاسی عقیدہ رکھتی ہے۔ لہذا حکومت کی پالیسی پر تنقید کے وقت فریقین میں انا کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا مفاہمت کی بجائے مناقشت ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اب فرمائیے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟ حضرت ابوبکرؓ نے رسولِ خدا کا ایک فرمان پیش کیا جس کے آگے انصار نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور امت میں پیدا شدہ انتشار کا طوفان اسی دم تھم گیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے "سیاسی عقیدے" الگ الگ نہیں تھے۔ تو کیا اندریں صورتِ حال انصار یا مہاجرین کو موجودہ سیاسی جماعتوں کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے؟

کیا عرب قبائل سیاسی جماعتیں تھیں؟

بعض دوسرے دوست مہاجرین و انصار کا نام تو نہیں لیتے وہ قبائل کو سیاسی جماعتوں کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اوس اور خزرج میں اندرونی طور پر رقابت موجود تھی۔ لیکن وہ اس "انتخابی معرکہ" میں متحد ہو گئے تھے۔ اسی طرح بنو ہاشم اپنے مفاد کی خاطر مہاجرین سے الگ ہو گئے تھے اور عرب میں قبائلی نظام، ان کی آپس میں رقابتیں اور لڑائیاں، یہ سب کچھ ایک دوسرے پر مسابقت اور حصولِ اقتدار کے لیے ہوتا تھا۔ اور پھر اس قبائلی نظام کی اسلام نے مذمت نہیں کی بلکہ یہ کہہ کر حوصلہ افزائی ہی کی ہے۔

يايها الناس انا جعلنكم شعوبا و قبائل لتعارفوا (۴۹/۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔

اس آیت کا مطلب تو صاف ہے کہ قبائل کا وجود فطری طور پر ظہور میں آیا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک دوسرے کو پہچاننے کا یہ ایک ذریعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ ہم ان دوستوں کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنھوں نے تعارف کے معنی کو بھی "غالب و مغلوب" کا جامہ پہنا دیا۔

بُرا ہو جمہوریت پرستی کا، اس نے انسانی ذہن کو کن راہوں پر ڈال دیا ہے۔ کیا ان بزرگ ہستیوں کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی ان میں پرانی جاہلیت برقرار رہی تھی؟ کیا وہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں چند لمحات کی نزاع کے بعد اسی طرح شیر و شکر نہیں ہو گئے تھے، جس طرح پہلے تھے؟ کیا ایسے اہم معاملہ میں وقتی شکر رنجی کے بعد فوری مفاہمت کے بلند کردار کی کوئی اور مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے؟

یہ درست ہے کہ بنو ہاشم کے چند افراد نے کچھ عرصہ تک بیعت نہیں کی۔ لیکن کیا کوئی ایک ادنیٰ سی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کر کے حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا ہو؟ یا اپنا مستقل وجود برقرار رکھنے پر اصرار کیا ہو۔ اگر کسی اجتہادی غلطی یا لبشری لغزش اور قرابتداری کی بنا پر بنو ہاشم خود کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے تو کیا انھوں نے اس معاملہ میں عصبیت اختیار کی تھی؟ آخر وہ کون سی بنیاد ہے کہ انھیں ہم موجودہ سیاسی جماعتوں کے مماثل قرار دے سکیں؟

سیاسی فرقوں اور مذہبی فرقوں میں فرق

سیاسی جماعتوں کے وجود کے جواز میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر فقہی اختلاف یا مذہبی فرقوں کا وجود برداشت کر لیا گیا ہے تو آخر سیاسی اختلاف اور سیاسی جماعتوں کے وجود کو کیوں ناجائز سمجھا جاتا ہے؟ ہم یہ عرض کریں گے کہ فقہی اختلاف سے مراد قرآن و سنت کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ قرآن و سنت کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس اختلاف میں بھی جب عصبیت پیدا ہو جائے تو فرقہ پرستی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ بھی کفر ہے[1] پھر ایک غلط بات کو جائز قرار دے کر اس کو دوسری غلط چیز کے لیے بنیاد قرار دے دینا کہاں تک درست ہے؟ سیاسی اختلاف ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس اختلاف کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اپنے ہم خیال لوگوں کا منظم ہونا اور پھر حصولِ اقتدار کے لیے کوشش کرنا اور پھر اسے درست سمجھنا اور اس پر اڑے رہنا ایک گمراہ کن امر ہے۔

[1] دیکھیے حدیث ۱۷ زیرعنوان ملی وحدت۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی فرقوں اور سیاسی فرقوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی قائدین نے کبھی اپنے تبایۓ مسلک کو قابلِ اتباع قرار نہیں دیا کہ اس عقیدہ کو لوگ اپنا کر فرقہ بنائیں اور اگر لوگ بنا لیں تو ان کی اپنی غلطی ہے جس سے قائد بیزار ہوتے ہیں۔ جبکہ سیاسی جماعتوں میں ایسی تنظیم بنانا لازمی شرط ہے۔ اور ان قائدین کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کا مقصد عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملانا اور اقتدار پر قبضہ یا اس کے حصول کی کوشش کرنا نہیں ہوتا جبکہ سیاسی جماعتوں کا اصل مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ ملک میں اپنی اکثریت پیدا کرنے کے لیے تشتت و انتشار پیدا کیا جائے اور پھر اس راستہ سے حکومت میں سے حصہ رسدی حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

ایک استفسار یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر اسلام میں سیاسی جماعتوں کا وجود گوارا نہیں تو جماعت اسلامی اور سید احمد شہید کی جماعت کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب:۔ سطح زمین پر آباد مخلوق انسانی کی دو ہی قسمیں قرآن کریم نے بتلائی ہیں۔

ھو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن (۶۴/۲)

وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے نام سے پکارا ہے۔ گویا بنیادی طور پر سیاسی پارٹیاں دو ہی ہیں (۱) اللہ کی پارٹی یا مسلمانوں کی جماعت (۲) شیطان کی پارٹی یا پوری دنیائے کفر۔

مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ و انتشار پیدا کرنا یا مذہبی اور سیاسی پارٹیاں بنانا بڑا جرم ہے جس کی تفصیل ہم "امت مسلمہ" کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ مغربی جمہوریت جیسے لادینی نظام میں ایسی سیاسی پارٹیوں کا وجود، جو خلوص نیت سے دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہوں، صرف اس حد تک اضطراراً گوارا کیا جا سکتا ہے کہ بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں کچھ نہ کچھ رکاوٹ پیدا کرتی رہیں۔ اور یہ اھون البلیتین میں سے ایک کم ضرر والی صورت کو اختیار کرنے کی شکل ہے۔ اب یہ جماعتیں خواہ جماعت اسلامی ہو، یا جمعیت علمائے اسلام یا جمعیت علمائے پاکستان، سب کی ایک ہی حالت ہے۔ جمہوری نظام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جماعتیں اپنا تشخص برقرار رکھیں جب کہ اسلامی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی سب پارٹیاں اپنا تشخص ختم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر کے ایک ملت واحدہ میں مدغم ہو کر حزب اللہ بن جائیں اور حزب الشیطان کے مقابلہ میں ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اگر ایسا نہ کریں تو اسے مسلمانوں کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اور سید احمد شہید کی جماعت معروف معنوں میں کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی جس نے اپنا علیحدہ نام تک رکھنا گوارا نہ کیا بلکہ وہ ایک تحریک تھی، جیسا کہ اسلام بذات خود ایک تحریک ہے، اس تحریک نے تبلیغ، ہجرت اور جہاد کا بالکل وہی طریق اختیار کیا جو انبیاء علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے اور جس طریق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں امت مسلمہ کی قیادت کی تھی۔ لہٰذا اسے تحریک علیٰ منہاج النبوۃ کہنا بالکل بجا ہے۔ اس جماعت نے گاندھی کا طرز سیاست اختیار نہیں کیا کہ ظالم کا گریبان پکڑنے کی بجائے اپنا گریبان پھاڑ کر سڑکوں پر واویلا کیا جائے تاکہ اندرونی اور بیرونی رائے عامہ اپنے حق میں استوار کرے۔ گرفتاریاں پیش کرے یا جیل میں اے کلاس کی درخواست کرے اور ضمانت پر رہائی کے بعد پھر گرفتاری اور اس کے بعد بھوک ہڑتال (خودکشی) کی دھمکیاں دیتی پھرے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر سڑک پر آ کر مرنا شہادت ہے تو گولی چلانے والوں کے لیے کیا فتویٰ ہے؟ اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے والوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی یہ کوشش اسلام اور جہاد کا نام لیے بغیر بھی کی جا سکتی ہے۔ آخر یہ انداز فکر اسلامی سیاست کا کونسا حصہ ہے۔ جہاں اسلام اور جہاد کا نام لینا ضروری ہو جاتا ہے؟

سید احمد شہید کی تحریک ایسی بیہودگیوں سے یکسر پاک تھی اور اس نے جو قدم اٹھایا اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح سمت میں اٹھایا تھا اور ہماری یہ دعا ہے کہ موجودہ دین پسند سیاسی جماعتیں بھی متحد ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اسوہ کی تقلید کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۴۔ بیعتِ خاص اور بیعتِ عام

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر خلافت کے انعقاد کے لیے بیعت سقیفہ بنو ساعدہ میں ہوئی۔ پھر دوسرے دن مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کیا۔ نامزدگی کے متعلق گفتگو آپ کے گھر پر ہوتی رہی۔ لیکن عام بیعت مسجد نبوی میں ہوئی۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کی خلافت سے متعلق مشورے تو حضرت مسور بن مخرمہ کے گھر پر ہوتے رہے لیکن عام بیعت مسجد نبوی میں ہوئی۔ حضرت علیؓ بھی یہی کچھ چاہتے تھے کہ ان کا انتخاب اور بیعت حسبِ دستور ہو۔ مگر ہنگامی حالات کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ البتہ بیعتِ عام مسجد نبوی میں ہی ہوئی۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ بیعت دو قسم کی ہوتی ہے :-

۱۔ بیعتِ خاص یہ بیعت خلافت کے انعقاد کے لیے ہوتی ہے اور اس میں صرف معزز افراد یا اہل شوریٰ حصہ لیتے ہیں جیسا کہ حضرت علیؓ نے باغیوں کے گروہ سے فرمایا تھا کہ :-

"خلیفہ کا انتخاب اہل شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے۔ ہم کسی وقت جمع ہوں گے اور اس پر غور کریں گے" (ابن قتیبہ۔ الامۃ والسیاسۃ جلد ا صفحہ ۴۱)

اس بیعت سے مقصد خلیفہ کا انتخاب، انتخاب کی توثیق اور سمع و اطاعت (حلفِ وفاداری) سب کچھ شامل ہوتا ہے۔

۲۔ بیعتِ عام بیعت خاص کے لیے کوئی خاص مقام مقرر نہیں لیکن بیعتِ عام کسی مرکزی مسجد میں برسرِ عام ہونی چاہیے۔ خلفائے اربعہ کی بیعتِ عام مسجد نبوی میں برسرِ عام اور اعلانات کے ذریعے ہوتی رہی۔ بیعت عامہ کا مقصد محض سمع و اطاعت ہے جیسا کہ تمام متعلقہ اور محولہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ عوام کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خواص کے فیصلہ کو تسلیم کر لیں۔ خلیفہ کے انتخاب میں عوام کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ نہ ہی انھیں اس بات کا اختیار ہے کہ خواص کے فیصلہ کو مجلس عام میں رد کر دیں۔ نہ ہی ایسی کوئی مثال پیش کی جا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے کچھ دوست یہ کہنے میں باک محسوس نہیں کرتے کہ اہل شوریٰ کے انتخاب کے بعد یہ فیصلہ عوام کے سامنے بغرض قبولیتِ عامہ" پیش کیا جاتا تھا چاہے تو اسے منظور کریں یا رد کریں۔

اور میں سمجھنے میں شاید غلطی پر نہ ہوں گا کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں امتِ مسلمہ جس تشتت و انتشار کا شکار رہی اور جنگ جمل و صفین جیسے معرکے پیش آئے تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کی بیعت عامہ تو ہوگئی لیکن اس سے پہلا اقدام "بیعتِ خاص" ان کی آرزو کے باوجود انھیں میسر نہ آسکا۔ کیونکہ خلیفہ کے انتخاب کے اہل ذمہ دار اور حق دار "اعیان ملت" ہیں عوام نہیں۔

ہمارے جمہوریت نواز دوست بیعتِ خاص اور بیعتِ عام کے موضوع سے تعرض نہیں کرتے۔ کیونکہ اسی سے موجودہ طرزِ انتخاب کے بنیادی عقیدہ "حق بالغ رائے دہی" پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں "ووٹ" کی مروجہ اصطلاح پہلے معنوں یعنی بیعتِ خاص کی ترجمانی کرتی ہے۔ جیسا کہ اس کے عنوان "حق بالغ رائے دہی" سے ظاہر ہے جب کہ بیعت عامہ محض ایک ذمہ داری ہے۔ حق نہیں۔

عموماً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی یا خلفائے راشدین میں براہ راست یا بالواسطہ انتخاب کا کوئی باضابطہ نظام موجود نہ تھا۔ لہٰذا مدینہ میں موجود بزرگ صحابہ (جو تمام عرب کے قبائل کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے) ہی خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیتے رہے۔

یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کی باقاعدہ مردم شماری کا رواج تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی پڑ چکا تھا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

عن حذیفة قال، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "اکتبوا لی من تَلَفَّظَ بالاسلام من الناس" فکتبنا لہ اَلفًا وخمس مائةٍ

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب کتابة الامام الناس)

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں۔ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر وہ شخص جس نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے ان کے نام لکھ کر مجھے دیئے جائیں؟ سو ہم نے آپ کے لیے فہرست تیار کی تو ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) مسلمان ہوئے۔

اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو یہ مردم شماری کا ایک الگ محکمہ بھی قائم ہوگیا تھا۔ اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالغ رائے دہی فی نفسہ کوئی پسندیدہ چیز تھی تو کسی بھی دور میں ان رجسٹروں سے کیوں نہ کام لیا گیا جب کہ انتخابی فہرستیں پہلے سے ہی موجود تھیں۔

بالغ رائے دہی کے حق میں دلائل

پہلی دلیل حق بالغ رائے دہی کے جواز میں مندرجہ ذیل آیت سے استدلال پیش کیا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (۴/۵۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل افراد کو دو۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اس حکم میں نمائندہ پر تو پابندی ہے کہ وہ اس کا اہل ہو۔ لیکن ووٹر پر کوئی عمل صالح کی کوئی پابندی نہیں، پھر اس عام حکم کو کس رو سے متقید کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس کون سا ایسا معیار ہے کہ ہم لوگوں کے اندرونی حالات کا پتہ لگاتے پھریں کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح؟ جبکہ قرآن کریم میں یہ بھی واضح حکم ہے کہ:

وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲)

اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو۔

جواب:۔ قرآن کریم میں بے شمار ایسے احکامات موجود ہیں جن میں صیغہ جمع حاضر استعمال ہوا ہے۔ حکم عام ہے لیکن اس کا اطلاق صرف اس کے اہل افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (۵/۳۸)

اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

آیت مذکورہ میں حکم عام ہے لیکن اس کے مخاطب صرف عمال حکومت ہی ہو سکتے ہیں۔ جو سزا دینے کے اہل ہیں۔ اب اگر اس حکم کو عام سمجھ کر عام لوگ بھی یہ فریضہ سرانجام دینے لگیں تو جو حشر ہوگا اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" کا حکم عام ہے اور قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ استعمال ہوا ہے لیکن اس کے مکلف صرف وہ لوگ ہیں۔ جو زکوٰۃ دینے کے اہل یا صاحب نصاب ہیں۔

گو ہم پہلے خلافت راشدہ کے نظائر سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عوام انتخاب میں حصہ لینے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکلف نہیں ہیں۔ تاہم اگر ہمارے دوستوں کو یہ اصرار ہے تو ہم وہ قیود بھی پیش کر دیتے ہیں جو شریعت نے اس عام حکم پر لگائی ہیں۔

ووٹر کی اہلیت

١۔ پہلی پابندی تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو کیونکہ اس آیت کے مخاطب مسلمان ہیں۔ کسی نام نہاد اسلامی ریاست کے عوام نہیں۔ اور مسلمان کی قانونی تعریف یہ ہے کہ وہ کم از کم نماز اور روزہ کا پابند ہو ورنہ ایک اسلامی مملکت میں وہ حقوق شہریت کا مجاز نہیں ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ویقیموا الصلوٰة ویؤتوا الزکوٰة فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءهم الا بحق الاسلام وحسابهم علی الله (مسلم۔ کتاب الایمان باب الامر بقتال الناس)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر ایسا کریں تو ان کی جانیں محفوظ ہو جائیں گی۔ الا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم رہیں اور ان کے باطن کا حساب اللہ پر ہے۔

٢۔ ووٹ جیسے ایک مقدس امانت ہے۔ ویسے ہی ایک شہادت بھی ہے کہ ووٹر فی الواقع (بدل و جان) اس نمائندے کو نمائندگی کا اہل تر سمجھتا ہے۔ جسے وہ ووٹ دے رہا ہے۔ لہٰذا جس شخص کی شہادت اسلام ناقابل قبول قرار دیتا ہے اس کو ووٹ دینے کا بھی حق نہیں پہنچتا۔ اور ایسے لوگ درج ذیل ہیں:۔

١۔ جس پر حد قذف نافذ ہو چکی ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا۔ (٢٤/٤)

اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو۔ اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔

٢۔ جھوٹی گواہی دینے والے لوگ جن کی جھوٹی گواہی ثابت ہو چکی ہو۔ قرآن میں مومن کی صفات سے ایک یہ بھی ہے:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۷۲/۲۵)

اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہوں سے ہے اور قابلِ تعزیر جرم بھی۔ حضرت عمرؓ جھوٹے گواہوں کا سر مونڈ کر چہرہ پر سیاہی لگا دیتے، پیٹھ پر کوڑے لگاتے اور طویل عرصے کے لیے قید کر لیا جاتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کبیرہ گناہ کیا کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا:

الاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس وشہادۃ الزور

(بخاری۔ کتاب الشہادات)

خدا تعالیٰ سے شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی

۲۔ فاسق کی شہادت قبول نہ کرنی چاہیے۔ ارشادِ باری ہے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمْ فَاسِقٌ فَتَبَیَّنُوْۤا (۶/۴۹)

اے مومنو! اگر کوئی بدکردار تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

انہی نصوص سے فقہا نے درج ذیل قسم کے اشخاص کی گواہی ناقابلِ قبول قرار دی ہے۔ (۱) نماز روزے کا عمداً تارک (۲) یتیم کا مال کھانے والا (۳) زانیہ۔ زانی (۴) لواطت کا مرتکب (۵) جس پر حدِ قذف نافذ ہو چکی ہو (۶) چور۔ ڈاکو (۷) ماں باپ کی حق تلفی کرنے والا۔ (۸) خائن۔ خائنہ۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہمارے پاس وہ کونسا معیار ہے جس سے ہم صالح اور غیر صالح کی تمیز کر سکیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنی مسجد سے رابطہ قائم فرمائیے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ وہاں سے آپ نماز ادا کرنے والوں، زکوٰۃ ادا کرنے والوں، چوروں، ڈاکوؤں، خائنوں اور فاسقوں سب کا پتہ چل جائے گا۔ پھر اگر کچھ غلطی ہو بھی جائے تو اس کا حساب اللہ پر ہے (بموجب حدیث) اور ایک مسلمان کے لیے یہ بات کافی ہے۔

دوسری دلیل

حق بالغ رائے دہی کے اثبات میں مندرجہ ذیل آیت پیش کی جاتی ہے جو آیۂ استخلاف کے نام سے مشہور ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔

اس آیت کی مختلف تعبیریں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی زبان سے سنیئے۔ ایک طرف آپ ایک سیاسی جماعت کے بانی اور جمہوریت نواز ہیں تو دوسری طرف مفسر قرآن۔ لہٰذا ان کی اپنی دونوں تحریروں میں یہ تضاد بہت واضح ہو گیا ہے۔

تشریح ۱ : "خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکز کر دیتے ہیں جو ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت ان کو تفویض کی ہے۔" (اسلام کا سیاسی نظریہ)

بات سیدھی سی تھی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَجَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا (۵:۲۰)

اور اللہ نے تم میں سے انبیاء بھی بنائے اور تم کو بادشاہ بھی بنایا۔

اب اس آیت میں صیغہ کُم جمع حاضر اور ملوک بھی جمع کا لفظ ہے۔ لیکن اس آیت سے کبھی کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ بنی اسرائیل کے جملہ افراد سارے کے سارے ہی بادشاہ تھے۔ جو اپنا حق ملوکیت کسی ایک خاص فرد کو منتقل کر دیتے تھے۔ لیکن آیت استخلاف میں مندرجہ بالا معنی کر کے بالغ رائے دہی کا حق ثابت کیا جاتا ہے۔

تشریح ۲ : اب اسی آیت مذکورہ کی تفسیر تفہیم القرآن میں اس طرح ہے :-

"اس ارشاد سے مقصود منافقین کو تنبیہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اخلاق و اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے والے ہوں اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس دعوے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے لہٰذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں"۔

یہاں حق بالغ رائے دہی کو بہت حد تک مقید کر دیا گیا ہے۔

اور تیسرے مقام پر مولانا موصوف خود ہی حق رائے بالغ دہی کا فیصلہ یہ فرما رہے ہیں

"حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے کہا

"تمھیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر چاہیں گے۔ وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے"۔ (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۰۶ بحوالہ ابن قتیبہ: الامامۃ والسیاستہ)

"اسلام کا نظریہ سیاسی" کے مطابق تو ہر بالغ مسلمان ووٹ کا حق دار ہے جب کہ تفہیم القرآن کے مطابق ووٹ دینے کا اہل صرف نیک، صالح اور متقی مسلمان ہو سکتا ہے۔ اب خلافت و ملوکیت کے مطابق حضرت علیؓ کی اپنی وضاحت یہ ہے کہ انتخاب صرف اہل بدر اور اہل شوریٰ کا کام ہے۔

بالفاظ دیگر نیک اور متقی لوگوں میں سے بھی چیدہ افضل ترین افراد (جسے اعیان ملت یا ارباب حل و عقد کہا جاتا ہے) کا انتخابی مہم میں حصہ لیتے ہیں۔ اور یہی بات حق ہے کہ بالغ رائے دہی کے حق کا عام تصور عقل اور شرع دونوں کے خلاف ہے۔ کسی لا مذہب سیاست میں تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی نظام میں ایسے بے ہودہ نظریات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

عورت کا ووٹ اور سیاسی حقوق

مغربی طرز انتخاب کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے عورت کو بھی اس میدان لا گھسیٹا ہے اور پھر مساوات مرد و زن کے نعرہ کی بدولت وہ ووٹر بھی ہے، ممبر اسمبلی بھی بن سکتی ہے، صدر بھی بن سکتی ہے اور دوسری کلیدی اسامیوں پر بھی فائز ہو سکتی ہے۔ عہد نبوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ خلافت راشدہ کی پوری تاریخ دیکھ جائیے آپ کو کوئی ایسی مثال نہ مل سکے گی کہ عورت نے ووٹ دیا ہو یا مجلس شوریٰ کی ممبر ہو یا کوئی کلیدی اسامی اس کے سپرد کی گئی ہو یا میدانِ امارت و سیاست میں اس کا کسی قسم کا عمل دخل ہو۔[1] قرآن میں بھی عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے۔ اور بخاری کتاب الاحکام اور اسی طرح دوسری احادیث کی کتابوں میں بھی۔ ان احادیث میں انہی امور پر بیعت کا ذکر ہے۔ جن کا ذکر قرآن کریم نے کر دیا ہے :۔

۱؎ **حضرت عائشہ اور جنگ جمل** خلافت راشدہ کے چالیس سالہ دور میں بس صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے جہاں میدان سیاست میں کسی عورت نے حصہ لیا ہو اور وہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی جنگ جمل میں شمولیت اور قیادت ہے جنھوں نے شہادت عثمانؓ اور قصاص کے جذبہ شدید کی وجہ سے جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ تو حضرت علیؓ نے اس اقدام کے متعلق انھیں لکھا کہ :۔

فانك خرجت غاضبة لله ولرسوله تطلبين امرا كان عليك موضوعا ما بال النسوة والحروب والاصلاح بين الناس۔ (الامامة والسياسة لابن قتيبة ص ۵۷)

"آپ اللہ اور رسول (کے احکام۔ قصاص) کے لیے غضبناک ہو کر ایک ایسے معاملہ کے لیے نکلی ہیں، جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں۔ بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں میں مصالحت سے کیا تعلق ہے؟"

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ــــ جو اس جنگ جمل میں غیر جانبدار تھے اور جنھیں حضور اکرمؐ نے نیک بخت آدمی (بخاری کتاب المناقب) فرمایا تھا ــــ کی حضرت عائشہؓ کی جنگ میں شمولیت کے متعلق یہ رائے تھی۔

ان بيت عائشة خير لها من هودجها (الامامة والسياسة لابن قتيبة ص ۶۱)

"حضرت عائشہؓ کا گھر ان کے لیے ہودج سے بہتر ہے"

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ :۔

۱۔ حضرت عائشہؓ کی جنگ میں شمولیت کی اصل وجہ حضرت عثمانؓ کا قصاص تھا نہ کہ سیاسی معاملات میں دلچسپی اور عمل دخل۔ اگر قاتلین سے شرع کے مطابق قصاص کا مسئلہ طے ہو جاتا تو انھیں شمولیت سے کوئی غرض نہ تھی۔ جیسا کہ اس موقع پر صلح کی بات چیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے نزدیک اس معاملہ کی نوعیت سیاسی ہرگز نہ تھی۔

۲۔ ان حالات میں بھی اکابر صحابہؓ نے حضرت عائشہؓ کی شمولیت کو مناسب نہیں سمجھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۔ (۱۲/۶۰)

اے پیغمبر! جب تمہارے پاس عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ تو شرک کریں گی، نہ چوری کریں گی، نہ بدکاری کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی (یعنی جو کہ ان کا نہ ہو اس کو اپنے خاوندوں سے منسوب نہ کریں گی) نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان کی بیعت لے لو اور ان کے لیے خدا سے بخشش مانگو۔

مساوات مرد و زن

اسلام مساوات مرد و زن کا ہرگز قائل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مکمل نہیں بلکہ نصف قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (۲/۲۸۲)

اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ بنانا پسند کرو۔

صرف یہی نہیں بلکہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے اور عبادت میں بھی عورت مرد کے برابر نہیں۔ حیض و نفاس کے ایام میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو "ناقص العقل والدین" کہا ہے۔ اور امارت و سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے ہرگز پسند نہیں کیا۔ نہ ہی خلفائے راشدین کے انتخاب میں عورت کے ووٹ کی کوئی مثال ملتی ہے۔ وجہ یہ

لہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے خلافت عثمان کے تقرر کے سلسلہ میں بعض پردہ نشین عورتوں سے بھی مشورہ لیا تھا۔ اس واقعہ سے عورت کا حق رائے دہی ثابت کیا جاتا ہے۔ جو دو وجہ سے غلط ہے:۔

۱۔ مشورہ ان کے گھر پر لیا گیا، پردہ کی حدود و قیود کو توڑا نہیں گیا۔ نہ انہیں خود کہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ نہ تو عورت کی جسمانی ساخت اور فطری صلاحیت ایسی ہے کہ امارت و سیاست جیسے معاملات میں وہ حصہ لے اور اسلام امیر کے لیے جن شرائط کی پابندی لگاتا ہے ان پر پوری اتر سکے اور نہ ہی اسلام ایسی بے حیائی اور مرد و عورت کے آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتا ہے جس کے بغیر ایسے امور میں حصہ لینا ناممکن ہے۔ نیز ایسی صورت میں عائلی نظام بھی تباہ ہو کر رہ جاتا ہے جو اسلامی نکتہ نگاہ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جب اہل ایران نے بنت کسریٰ (پوران، نوشیرواں کی پوتی اور خیرو بیکی بہن) کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ یہ خبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا:۔

کیف یفلح قوم وّلوا امرھم امرأۃ (بخاری - کتاب المغازی)

وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنی سربراہ ایک عورت کو بنا لیا ہے۔

ایک اسلامی معاشرے میں ایسے امور کا عورتوں کے ہاتھ میں چلے جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہوتی۔ درج ذیل حدیث اس پہلو پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اذا کان اُمَرَاءُکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم واُمورکم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیرٌ لکم من بطنھا واذا کان اُمراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلاءکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیرٌ من ظھرھا (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ باب تغیر الناس)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمہارے حکمران اچھے لوگ ہوں اور تمہارے دولتمند سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوں تو تمہارے لیے زندگی موت سے بہتر ہے اور تمہارے حکمران بدکردار ہوں اور دولت مند بخیل ہوں اور تمہارے معاملات بیگمات کے حوالے ہوں تو تمہاری موت زندگی سے بہتر ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) جا کر مشورہ سے مطلع کرنے کو کہا گیا۔

۲۔ صرف ان عورتوں سے مشورہ کیا گیا۔ جنھیں اس کا اہل سمجھا گیا۔

رہا صاحب الرائے عورتوں کے مشورہ سے استفادہ کا معاملہ تو اس پر کوئی پابندی نہیں، اکابر صحابہؓ حضرت عائشہؓ سے مسائل پوچھتے اور مشورہ لیا کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کا مقام

ہو سکتا ہے ہمارا نوجوان طبقہ اور موجودہ دور کی مہذب عورتیں ان احکام و ارشادات سے یہ تاثر لیں کہ اہل مغرب نے عورت کو جو حقوق عطا کیے ہیں وہ اسلام کے عطا کردہ حقوق سے کہیں زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغرب نے عورت کو کس طرح کے حقوق بخشے ہیں اور اسلام نے کیسے؟

مغرب نے عورت کو آزادی اور مساوات کے نام پر جو حقوق دیے ہیں وہ انھوں نے عورت کو پہلے مرد بنا کر عطا کیے ہیں۔ اسے ملازمتوں اور کھیلوں، مقابلۂ حسن اور دوسری تفریحات کے بہانے گھر سے نکال کر بازار میں لا کھڑا کیا تو مردوں نے اس سے اپنی جنسی ہوس کی تکمیل کی۔ فحاشی اور بے حیائی عام ہوئی۔ اور جب عورت اپنی جوانی کی عمر سے گزر کر اپنی رعنائی کھو بیٹھتی ہے تو اس کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ مگر کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں ہوتا اور بڑھاپے کے ایام اپنی اولاد کی یاد اور تڑپ میں سسکیاں بھر کر گزار دیتی ہے جبکہ اس کی اولاد — اسی کی طرح — اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہوتی ہے اور اس بوڑھی کھوسٹ کی آرزوؤں کو اپنی عیش و طرب میں مداخلت تصور کر کے اسے دھتکار دیتی ہے۔ ایسے بے شمار واقعات مغربی دنیا کے جرائد میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں۔

اسلام نے عورت اور مرد کے دائرۂ کار الگ الگ مقرر کیے ہیں۔ اور ایک کے دائرہ میں دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ عورت کی فطری ساخت اور طبیعت اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ معاشی اور سیاسی الجھنوں سے آزاد ہو کر بال بچوں کی نہایت اطمینان سے تربیت کرے اور گھر کے اندر کا پورا انتظام سنبھالے اور نہایت باوقار طریقے میں اپنے گھر میں خود مختار بن کر اپنی اولاد کی بہتر سے بہتر تربیت کرے۔ مرد کے دائرۂ کار میں اس کی مداخلت کو اسی لیے ناپسند کیا گیا ہے[1]۔ اس پہلو کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کہیں تو عورت کا درجہ

---

[1] مغربی تہذیب مذہب سے بیزاری اور لادینیت کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئی۔ موجودہ دور کا مہذب انسان اپنے مسائل خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر حل کرنے پر مصر ہے۔ انہی مسائل میں سے ایک شادی کا مسئلہ بھی ہے۔ "مساواتِ مرد و زن اور عورت کی آزادی" کے نعروں کی مقبولیت کے بعد عورت کی آزادی سے یہ مطلب لیا جانے لگا ہے کہ وہ اپنے گھر کو خیرباد کہہ کر ہر شعبہ (باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com